عاش سعیداً و مات شہیداً

مفتی شعیب عالم
استاذ جامعہ و مفتی دارالافتاء

دنیا عالم اضداد ہے اور اضداد کے مابین منافرت ہوتی ہے، اس لئے ان کا اجتماع واتحاد نہیں ہوسکتا۔ دھوپ اور چھاؤں جمع نہیں ہوسکتے، سیاہی اور سفیدی اکٹھی نہیں ہوسکتی، زمین اور آسمان کے فاصلے ختم نہیں کئے جاسکتے اور مشرق اور مغرب کی دوریاں مٹائی نہیں جاسکتیں۔ اگر اضداد قریب آئیں تو وہ ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور ایک دوسرے کا وجود مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوا مٹی کو اُڑا دیتی ہے یا مٹی ہوا کو دبا دیتی ہے، پانی آگ کو بجھا دیتا ہے یا آگ پانی کو بھاپ میں بدل دیتی ہے۔ اسی نفرت اور عناد کا نتیجہ ہے کہ عنصر عنصر سے، نوع نوع سے اور جنس جنس سے متزاحم ومتصادم ہے اور ان میں باہمی کش مکش جاری ہے۔ یہ تصادم اس حد تک ہے کہ ایک ہی نوع کے افراد ایک دوسرے کو مرنے مارنے اور مٹنے مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، انسان انسان کو اور حیوان حیوان کو فنا کے گھاٹ اتار رہا ہے، بھائی بھائی کا گلہ کاٹ رہا ہے اور قومیں مقابلے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں اور خونخوار درندوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھ رہی ہیں۔

''اضداد کا تصادم'' بظاہر کچھ غیر حکیمانہ معلوم ہوتا ہے، مگر ترقی اور نمو اسی تصادم کے نتیجے میں ہوتی ہے، بلکہ ترقی نام ہی تصادم کا ہے۔ اسی سے مخفی جوہر کھلتے ہیں، پوشیدہ قوتیں آشکارا ہوتی ہیں اور نئی نئی اشیاء ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ حقیقت میں یہ قانون خدا کی ربوبیتِ عامہ اور رحمتِ تامہ کا مظہر ہے اور خلق خدا کے لئے حد درجہ نافع اور مفید ہے۔ جو چیز متحارب ومتصادم قوتوں سے نبرد آزما نہیں ہوتی اور جو چیز ناموافق حالات اور مخالف قوتوں سے برسر پیکار نہیں ہوتی، وہ رُک جاتی ہے اور آگے ترقی نہیں کرسکتی۔ دریا کی راہ میں اگر پتھریلی چٹانیں حائل نہ ہوں تو اس کی تیزی اور روانی سکون اور جمود میں تبدیل ہوجائے، چقماق کی شعلہ فشانی پتھر کی رگڑ کے بغیر ممکن نہیں، پانی کے اندر مخفی قوتیں ٹکراؤ کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوتیں اور تاروں کو چھوئے بغیر آلے کے اندر خوابیدہ نغمے بیدار نہیں ہوتے۔ باہمی رقابت اور چشمک جس طرح مادی اشیاء میں ہوتی ہے، اسی طرح معنوی اشیاء میں بھی جاری رہتی ہے۔ معنویات کی باہمی کش مکش بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی مادیات کی ہے، وہ بھی ایک دوسرے سے برسر پیکار اور نبرد آزما رہتی ہیں۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ابلیس کی نمود بھی ہوگئی تھی اور اسی روز سے حق اور باطل کی کش مکش اور خیر وشر کا تصادم جاری ہے اور تاصبح قیامت جاری رہے گا۔ مٹی اگر پانی کی لطافت کو اور پانی مٹی کی کثافت کو ختم کرنا چاہتا ہے تو نیکی بھی بدی کا اور بدی بھی نیکی کا وجود

مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ صاف خون اگر فاسد غذا کو قبول نہیں کرتا، صالح معاشرہ کو اگر برائی سے گھن آتی ہے اور نیک و پارسا لوگ اگر سرکشوں اور بدکاروں کو برداشت نہیں کرتے ہیں تو سرکشوں اور بدکاروں کے لئے بھی نیکوکاروں کا وجود ناقابل قبول ہوتا ہے۔ روشنی سے انسان راہ یاب ہوتا ہے، ٹھوکروں سے بچتا ہے اور سانپ اور رسی میں فرق کرلیتا ہے، مگر یہی روشنی چوروں اور لٹیروں کے لئے باعث تکلیف ہوتی ہے اور ان کے مقاصد میں رکاوٹ بنتی ہے، اس لئے وہ روشنی کے چراغ گل کرتے ہیں۔ انسان جب اس حد تک گراوٹ اور پستی کا شکار ہوجاتا ہے تو پھر اُسے نیکی سے گھٹن ہوتی ہے اور اچھے لوگوں کا وجود اُسے زہر معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر قلب کا رخ اور سوچ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور انسان معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھنے لگتا ہے۔ حدیث میں تو اس کا صاف تذکرہ ہے ہی، قرآن کریم میں بھی اس مضمون کی بے شمار آیتیں موجود ہیں۔

مادی اشیاء کے باہم ٹکراؤ میں جو چیز قوی اور طاقتور ہوتی ہے وہ برتر اور غالب رہتی ہے اور جو کمزور ہو اُسے شکست و ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے، مگر حق و باطل کے نزاع اور خیر و شر کے تصادم میں فتح اور کامرانی حق کی ہوتی ہے۔ خالق کائنات صرف خیر اور حق کو باقی رکھتا ہے۔ اس نے یہاں ''بقائے انفع'' کا قانون نافذ کر رکھا ہے۔ جو بھی چیز، فرد یا جماعت نافع اور مفید ہوگی، وہ باقی رہے گی اور فتح و کامرانی اسی کا مقدر ہوگی۔

''فَـأَمَّاالزَّبَدُفَيَذْهَبُ جُفَآءً وَأَمَّامَايَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِيْ الْأَرْضِ، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ''. (الرعد:۱۷)

فتنہ تاتار سے زیادہ سخت اور کڑا وقت مسلمانوں پر کبھی نہیں آیا، انہوں نے مسلمانوں کو شکست دی، ان کی تلواروں کو کند، شہروں کو تباہ، بستیوں کو ملیامیٹ اور اموال کو برباد کیا اور ایسی تباہی مچائی کہ اسلام کے مستقبل سے ہی مایوسی ہوگئی تھی۔ مسلمان مؤرخ جب اس کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا قلم رو پڑتا ہے، مگر تاتاری جلد ہی مغلوب ہوگئے، حالانکہ فاتح اور غالب بن کر داخل ہوئے تھے۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ وہ کوئی مفید اور نافع پیغام نہیں رکھتے تھے۔ علماء کی جماعت سے زیادہ نافع، مفید اور کارآمد اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟ دنیا کی بقا اور آخرت کی کامیابی ان ہی کی بدولت ہے۔ دنیا کی تخلیق خدا کی بندگی کے لئے ہے اور بندگی کے لئے علم کی ضرورت ہے اور علم کے لئے علماء کی ضرورت ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ دنیا کو علماء کی ضرورت ہے۔ اس تناظر میں عالم کی شہادت گویا دنیا کی طنابیں کھینچنے کی کوشش ہے اور اس کی بنیاد پر کاری ضرب ہے۔

۳۱؍جنوری ۲۰۱۳ء کی دوپہر عالم اسلام کی ممتاز دینی درسگاہ، خیر کے منبع، رحمت کے مہبط اور روحانی علوم کے سرچشمہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے دو جید، تجربہ کار اور پختہ مفتیانِ کرام، دارالافتاء جامعہ بنوری ٹاؤن کے مسئول حضرت مولانا مفتی عبدالمجید دین پوری اور استاد محترم مفتی صالح محمد کاروڑی اور ان کو لانے لے جانے کی خدمت پر مامور طالبعلم حسان علی شاہ کو برسرعام لہو میں نہلا دیا گیا۔ إناللّٰه وإناإليه راجعون۔

جامعہ کے ساتھ اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ نہیں ہے، شہادتوں کا اِک تسلسل اور خونِ شہداء کا ایک سیل

رواں ہے جو جامعہ کے وجود سے بلا انقطاع جاری ہے۔ جامعہ کے علاوہ پورے ملک کو بالعموم اور کراچی کو بالخصوص دہشت گردی نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، جس میں کمی کی بجائے زیادتی اور تخفیف کے بجائے دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ عرب کے وحشی اپنی جنگجویانہ فطرت اور لڑاکو طبیعت کے باعث بجا طور پر بدنام ہیں۔ وہ خون ریزی، قتل وقتال اور جنگ وجدال میں ایک پیشے اور مشغلے کے طور پر مصروف رہتے تھے، مگر ایسا صرف سال کے دو تہائی حصے میں ہوتا تھا، ایک تہائی یعنی چار مہینے ان کی تلواریں نیام میں رہتی تھیں اور قتل وغارتگری کا بازار ٹھنڈا رہتا تھا۔ یہ آج کے تہذیب یافتہ لوگوں کا کمال ہے کہ سال کے کسی مہینے، مہینے کے کسی ہفتے، ہفتے کے کسی دن اور دن کے کسی گھنٹے درندگی اور سفاکی سے باز نہیں آتے۔ نہ کوئی موسم دیکھتے ہیں، نہ کوئی مقدس دن، نہ کوئی قومی یا مذہبی تہوار۔ خوف اور دہشت کا، ظلم اور بربریت کا بازار گرم ہے۔ بوری بند لاشیں، چھلنی سینے، اعضاء کٹے جسم، ہوا میں بارود کی بو اور فضا میں دھوئیں کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ خون گرتا ہے اور بہہ جاتا ہے، سر کٹتا ہے اور فرش کے برابر ہو جاتا ہے، لاشوں کے ڈھیر لگتے ہیں اور زمین میں دفن ہو جاتے ہیں، مگر کوئی ان ظالموں کے ہاتھ روکنے، دستانے اتارنے اور چہروں سے نقاب ہٹانے والا نہیں ہے۔ جنگل میں درندے امن سے ہیں، مگر آبادی میں انسان بدامنی کا شکار ہیں۔ امن منہ چھپائے پھر رہا ہے، نیکی نوحہ کناں ہے، خیر کی کسمپرسی قابل دید ہے۔ خدا کی وسیع سرزمین اس کے بندوں پر تنگ کر دی گئی ہے اور انسان سے وہ اعزاز واکرام چھین لیا گیا ہے جو خدائے تعالیٰ نے ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ'' کہہ کر اُسے عطا کیا ہے۔ زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ خون کے قطرے اور لہو کے دھارے بھی ذمہ داروں کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام ہیں، حالانکہ نہ مرض کی تشخیص کے لئے کسی افلاطونی ذہن کی ضرورت ہے، نہ اسباب ووجوہات کا پتہ چلانا ان کے لئے کوئی مشکل ہے اور نہ ہی نسخے کی تجویز ان کی طاقت اور امکان سے باہر ہے۔ موت اٹل حقیقت ہے اور کسی ذی نفس کو اس سے مفر نہیں۔ اس لحاظ سے وہ کوئی زیادہ قابل افسوس چیز نہیں ہے، لیکن اگر اس کا شکار ایسا فرد ہو جو بے پناہ خوبیوں کا مالک ہو، قحط الرجال کے دور میں لاکھوں کروڑوں میں سے ایک ہو تو اس کا جانا یقیناً قیامت ہے۔ افسوس اس وجہ سے بھی ہے کہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور جو کام انبیاء کا ہے وہی علماء کا ہے۔ تاریخ میں ایسے شقی القلب گزرے ہیں، جنہوں نے انبیاء کو اہل خانہ سمیت در بدر کیا ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا یہ تو ''یہود کی خصلت'' رہی ہے، قرآن نے ان پر انبیاء کے قتلِ ناحق کی دفعہ لگائی ہے ''وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ''۔ اللہ نہ کرے کہ کسی مسلمان کے ہاتھ سے یہ فعلِ بد انجام پایا ہو، اگر ایسا ہے تو پستی کی جس حد تک ہم پہنچ چکے ہیں، اس پر خون کے آنسو بھی کم ہیں۔

حضرت الاستاذ حضرت مفتی عبدالمجید دین پوری شہیدؒ کی ولادت ۱۵؍جون ۱۹۵۱ء کو خان پور کے قریب دین پور نامی بستی میں ہوئی، یہ وہی قصبہ ہے جو تحریکِ آزادی کے حوالے سے بہت مشہور رہا ہے، جس وقت کہ یہ قصبہ ''تحریک ریشمی رومال'' کا مرکز تھا اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس کا خاص اور مرکزی کردار تھے۔ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ ددھیال کی طرف سے آرائیں ذات کے تھے، جو محمد بن قاسم کے ساتھ حجاز سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کے والد ماجد مولانا محمد عظیمؒ دیوبند کے فاضل اور حضرت مدنیؒ کے شاگرد تھے اور نہایت متقی، پرہیزگار اور شب بیدار عالم تھے۔ ننھیال کی طرف سے

حضرت مفتی صاحب شہیدؒ خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ کے پڑنواسے تھے۔ حضرت خلیفہؒ اصلاً ضلع جھنگ کے رہنے والے تھے، مگر اپنے مرشد حضرت حافظ محمد صدیقؒ کے حکم پر ایک صحرا (دین پور) میں قیام پذیر ہوئے اور جلد ہی خلق خدا کا دیوانہ وار رجوع ہونے لگا۔ موجودہ دین پور آپ ہی کا آباد کیا ہوا ہے اور اس نسبت سے بانی دین پور بھی کہلاتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کا ریشمی خط آپ کے پاس بھی آیا تھا اور تحریک کے دوران بڑی مقدار میں آلاتِ حرب وضرب یہاں جمع کئے گئے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ جیسے اکابر نے آپؒ سے کسب فیض کیا۔ جلیل القدر اور عالی مرتبت اشخاص نے آپؒ کے حق میں بہت بلند تعریفی کلمات کہے ہیں، جن سے آپؒ کے مقام رفیع کا اندازہ ہوتا ہے:

''حضرت دین پوری کی صحبت اور نشست وبرخاست میں طالب کو جو کچھ ملتا ہے، وہ دوسرے بزرگوں کے ہاں ورد، اور اَوراد سے بھی نہیں ملتا''۔ (حضرت شیخ الہندؒ)

''حضرت دین پوری کی ولایت مسلم ہے''۔ (حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

''حضرت دین پوری کے چہرے پر صرف نظر ڈالنے سے کئی مقامات طے ہوجاتے ہیں''۔ (حضرت کشمیریؒ)۔

حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح اپنے پیر بھائی مولانا عبدالقادر سے کیا، جس سے ایک فرزند مولانا عبدالمنانؒ تولد ہوئے، جو کہ حضرت شہیدِ راہِ حق کے نانا تھے اور مفتی صاحب شہیدؒ کی تعلیم وتربیت ان ہی کے زیرسایہ ہوئی تھی۔ مولانا عبدالمنانؒ کے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں اور آپ اپنے خاندان کے ولی اور سرپرست تھے اور جملہ امور آپ کو تفویض تھے۔ اس خاندانی سربراہی کی بدولت آپ نے اپنے نواسے یعنی حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کا اپنی پوتی کے ساتھ نکاح کردیا۔ نکاح کی محفل اس لحاظ سے دلچسپ تھی کہ اصلاً حضرت مفتی صاحب کے نکاح کے لئے منعقد ہی نہیں کی گئی تھی، کسی اور صاحب کی مجلس نکاح تھی۔ حضرت مفتی صاحب بھی حاضر مجلس تھے۔ ان صاحب کے نکاح کے بعد نانا جان مولانا عبدالمنان کی نگاہ اپنے نواسے حضرت مفتی صاحب پر پڑی اور نکاح خواں سے فرمایا کہ ان کا نکاح بھی پڑھادو۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے دیگر آٹھ بھائی تھے (جن میں سے ایک کا حضرت سے پہلے انتقال ہوگیا تھا) اور دو بہنیں حیات ہیں۔ خود حضرت مفتی صاحب نے ایک بیوہ اور چار بیٹے اور دو بیٹیاں سوگوار چھوڑی ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی رسم بسم اللہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے کروائی تھی اور اس موقع پر آپ کے نانا نے موتی چور کے لڈو تقسیم کئے تھے۔ (حضرت شہیدؒ موتی چور کی وضاحت بھی کرا کرتے تھے)۔ ابتدائی تعلیم آپ نے دین پور کے قرب ونواح میں مولانا عبیداللہ درخواستیؒ سے حاصل کی، مولانا عبیداللہؒ پہلے لیاقت پور، پھر سنجا اور پھر تاج گڑھ تشریف لے گئے اور حضرت شہیدؒ بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ سادسہ کے لئے آپ جامعۃ العلوم الاسلامیہ تشریف لائے اور یہاں کی قدآور علمی شخصیات محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مفتی ولی حسن ٹونکیؒ اور مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ ۱۹۷۱ھ میں امتیازی درجات کے ساتھ سند فراغت حاصل کی۔ جامعہ کے ریکارڈ کے مطابق

آپؒ کا رول نمبر ۱۳۲، رجسٹریشن نمبر ۶۸۷ ہے۔ ۲۸ محرم ۱۳۹۳ھ کو آپؒ کو سند فراغت کی حوالگی ہوئی۔ فراغت کے بعد جامعہ میں حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کے زیر نگرانی تخصص فی الفقہ کیا اور ساتھ ہی کراچی یونیورسٹی سے بی اے بھی مکمل کیا۔ حضرت شہیدؒ خود بیان کیا کرتے تھے کہ مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کی طرف سے مجھے اُن کے درس ہدایہ میں بیٹھنے کی تلقین تھی۔ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کے حکم پر احقر بھی ان کے درس ہدایہ میں بیٹھا کرتا تھا۔ یہ ایک ظاہری سی مشابہت ہے، کیا بعید کہ حق تعالیٰ شانہ ان دونوں بزرگوں کے طفیل حقیقت بھی نصیب فرمادیں۔ **وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز** ۔اس کے بعد دارالعلوم حسینیہ شہداد پور میں بحیثیت مدرس تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ قاری عبدالرشید اور مفتی عبدالمنان صاحب آپ کے معروف شاگرد ہیں، جنہوں نے آپ سے حماسہ پڑھی ہے۔ والد صاحب کے وصال کے بعد آپ خان پور تشریف لے گئے اور مدنی مسجد چوک رازی خان پور میں امامت وخطابت کی خدمت انجام دینے لگے۔ یہ وہی مسجد ہے جس کی بنیاد آپ کے والد ماجد مولانا محمد عظیمؒ نے رکھی تھی۔ ساتھ ہی پرانے تبلیغی مرکز میں تدریس شروع کی اور مسجد کے متصل رفاہِ عام کے نام سے مطب قائم کیا۔

علمِ طب کی بدولت آپ امراض، اُن کے طریقۂ علاج، ادویہ اور ان کے خواص واثرات سے آگاہی رکھتے تھے اور اس موضوع کے متعلق سوالات کا بصیرت کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ ابھی کچھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ ایک شئے کی ترکیب کے متعلق ہمارے ہاں ایک تحریری سوال جمع ہوا۔ سوال ایک ادارے کی طرف سے تھا اور مہارت سے تیار کیا گیا تھا اور اس پر ایک کیمیا داں کے تصدیقی دستخط بھی ثبت تھے۔ احقر نے سوال کی بنیاد پر جواب لکھا، مگر حضرت نے سوال اور جواب دونوں مسترد کر دیئے، جب مزید تحقیق کی گئی تو حضرت کا اعتراض درست تھا اور سائل اور مجیب دونوں سے چوک ہوئی تھی۔ علم طب کے علاوہ آپ ایک اور فن اس حد تک جانتے تھے کہ اُسے باقاعدہ ذریعہ معاش بنا سکتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''**الذین أحصروا فی سبیل اللّٰہ**'' کی فضیلت بھی نوازنا تھا، اس لئے آپ ان دونوں فنون سے مجتنب رہے۔

تبلیغی مرکز کے بعد آپ دین پور شریف میں تدریس کے شعبے سے منسلک ہوگئے، بعد ازاں ۱۹۸۸ء سے ۹۵ء تک جامعہ اشرفیہ سکھر سے وابستہ رہے۔ اور وہاں ہدایہ ثالث، اور ترمذی وغیرہ آپ کے زیر تدریس رہیں، ایک سال بخاری ثانی بھی پڑھائی اور ختم بخاری شریف کیا۔ تین سال وہاں ایک قریبی مسجد میں امام وخطیب بھی رہے تھے۔ سکھر کے قیام کے دوران جب آپ کسی نجی غرض اور ذاتی حاجت کے سلسلے میں کراچی تشریف لائے تو حضرت شہیدؒ کے بہ قول یہاں ایک مدرسے میں آپ کو بڑے درجات کی کتب اور معقول مشاہرے کی پیش کش ہوئی، اگرچہ آپ کی طبیعت اب کراچی کو مستقل جائے قیام بنانے کی تھی، مگر صاحب نظر اور بصیرت قلبی کے حامل بزرگ، فقیہ اعظم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکیؒ سے مشاورت کے بعد انکار فرما دیا اور واپس تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہیدؒ جن کو گوہر نایاب کی پہچان اور اُنہیں لڑی میں پرونے کا ملکہ اور سلیقہ تھا، وہ حسنِ تدبیر اور حسنِ انتظام سے آپ کو جامعہ لے آئے اور ۱۹۹۶ء میں بحیثیت مدرسِ کتب اور نائب رئیس دارالافتاء آپ کی تقرری عمل میں آئی۔ دارالافتاء کے رئیس حضرت مولانا مفتی عبدالسلام صاحب چاٹگامی مدظلہٗ نے بھی اس سلسلے میں بھرپور معاونت

کی تھی۔ (حضرت مفتی صاحب شہیدؒ اس پوری روئیداد کو اپنی تمام جزئی تفصیلات سمیت سنایا کرتے تھے)

طریق عشق میں گو کارواں بہ کارواں بدلا
نہ ہم نے راستہ بدلا نہ میر کارواں بدلا

عنایاتِ الٰہی عام طور پر اسباب سے متعلق ہو کر ظاہر ہوتی ہیں۔ حضرت الاستاذ کا معاملہ بھی کچھ اس قسم کا تھا۔ اچھے شہسوار کو سبک رفتار سواری اور مضبوط باز و کو تیز دھار تلوار میسر آجائے تو پھر رفتار اور کاٹ دوچند سہ چند ہو جاتی ہے۔ جامعہ میں نہ صرف مفتی صاحب کے مخفی جوہر کھلے، بلکہ انہوں نے ایسا جوش مارا کہ ایک عالم کو سیراب کر دیا۔ جامعہ میں تدریس اور افتاء کے ساتھ آپ الحمراء مسجد جمشید روڈ میں پنجگانہ نمازوں کے امام اور جامعہ درویشیہ سندھی مسلم سوسائٹی میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے۔ شہادت کے روز آپ اپنے رفقاء سمیت جامعہ درویشیہ ہی تشریف لے جا رہے تھے۔ مدرسہ معہد الخلیل بہادر آباد میں مغرب کے بعد تشریف لے جاتے اور آمدہ سوالات کی تصحیح فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مفتی نظام الدین شامزیؒ کی شہادت کے بعد ترمذی ثانی اور تخصص میں مقدمہ شامی وغیرہ کا درس آپ کے سپرد تھا، اس سے قبل آپ ہدایہ ثالث پڑھایا کرتے تھے۔ آپ کا درس نہایت سنجیدہ اور متین ہوا کرتا تھا۔ درس کے لئے تشریف لے جانے سے قبل صاحبِ کتاب کے لئے دعا اور ایصال ثواب کرتے اور درس میں شستہ، شگفتہ اور شائستہ زبان استعمال فرمایا کرتے تھے۔ پانی کے بہاؤ کی طرح زبان سے الفاظ نکلا کرتے تھے اور کبھی اس میں خطابت کا آہنگ اور تقریر کا جلال پیدا ہو جایا کرتا تھا۔ آواز بلند، بیان تسلسل سے مزین اور لغزش ولکنت سے پاک ہوا کرتا تھا۔ عام فہم اور سادہ الفاظ میں پہلے عبارت کا مطلب بیان کرنے کے بعد جب اس کا ترجمہ اور حل طلب نکات کی تشریح کرتے تو معمولی استعداد کے طلبا بھی سمجھ جایا کرتے تھے۔ علمی لطائف اور سلف صالحین کے واقعات موقع ومحل کی مناسبت سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ تجزیہ وتحلیل اور تجربہ وتمثیل سے درس کی رونق اور بڑھ جایا کرتی تھی۔ وہ خصوصیت جس کی وجہ سے آپ کا درس ایک امتیازی شان رکھتا تھا وہ قدیم اجتہادات کی روشنی میں جدید عصری مسائل کا حل پیش کرنا ہے۔ درس میں جب کوئی ایسا مقام آتا جس کا کسی نو پید مسئلے سے تعلق ہوتا تو وہاں بسط وتفصیل سے کام لیتے۔ کسی عبارت کے تحت کن مسائل پر گفتگو کرنی ہے اور کس قدر کرنی ہے؟ کہنہ مشقی کی بدولت یہ فیصلہ آپ کے لئے مشکل نہیں تھا۔ کوئی عبارت جس سے موجودہ علماء کسی مسئلے کے جواز یا عدم جواز پر استدلال کرتے ہوں، اس کی وضاحت فرماتے۔ تفہیم کے لئے بجائے قدیم تمثیلات کے جدید تمثیلات پیش فرمایا کرتے تھے۔

تقریر اور خطابت کے معاملے میں برملا کسر نفسی اور عجز وانکساری کا اظہار فرمایا کرتے تھے، مگر جب منبر کو رونق بخشتے تو الفاظ کانوں کے راستے دل پر دستک دیتے تھے۔ تقریر اگر اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کا عمدہ اور احسن اظہار ہے اور سامعین کو کسی مقصد پر آمادہ کرنا اور یہ کوشش کرنا کہ وہ بھی وہی محسوس کرنے لگیں جو مقرر محسوس کرانا چاہتا ہے تو حضرت کی تقریر مذکورہ اوصاف کی حامل اور ان خصوصیات سے مزین ہوا کرتی تھی۔ طوفانی لہجہ، طغیانی اسلوب، گن گرج، جھنکار وللکار، الفاظ کی بھرمار اور فقروں کی یلغار نہ تقریر کا حصہ ہیں اور نہ ہی حضرت اُسے پسند فرمایا کرتے تھے۔ البتہ جب شکار نشانے پر آجائے، لوہا گرم

ہوجائے اور کھیتی پک جائے تو پھر تاخیر کا مطلب محنت کا ضیاع ہوتا ہے۔ سمجھ دار اور عوام کی نفسیات سے واقف مقرر ایسے موقع پر الفاظ کے زیر و بم اور لہجے کے اتار چڑھاؤ سے لوگوں کے جذبات وصول کر لینا چاہتا ہے۔ حضرت شہیدؒ کا لہجہ بھی ایسے مواقع پر بلند ہوجایا کرتا تھا، گویا گرم لوہے پر پے در پے ضربیں لگا رہے ہیں۔

اصلاحی تعلق اسی مشہور و معروف، روحانی، علمی، تاریخی اور انقلابی خانقاہ دین شریف سے تھا۔ ہالیجی شریف سے بھی ربط و تعلق رکھتے تھے اور گاہے گاہے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔ سفر و حضر میں وضو پر مواظبت فرمایا کرتے تھے۔ دوران سفر راستے میں کبھی ایسا ہوتا کہ وضو کے لئے مناسب جگہ دستیاب نہیں ہوتی تھی، مگر حضرت گھٹنوں کی تکلیف کی شدت کے باوجود معمول پورا فرمالیا کرتے تھے۔ ''**الأجر بقدر التعب والمشقة**'' کے قاعدے سے یقیناً یہ وضو زیادہ اجر و ثواب اور فضیلت رکھتا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ دن بھر کے تھکا دینے والے سفر کے بعد نصف شب کے قریب آرام کا موقع ملا، مگر جب صبح فجر کے لئے آنکھ کھلی تو حضرت شہیدؒ کو مراقب پایا، جس کا مطلب تھا کہ حضرت تہجد، ذکر اور دعا وظائف سے فارغ ہو چکے ہیں۔ سفر میں فجر سے گھنٹہ بھر قبل بیدار ہوجایا کرتے تھے۔

آپ کا اصل میدان فقہ اور فتاویٰ کا میدان تھا۔ بلا مبالغہ آپ ملک کے صف اوّل کے مفتیان کرام میں سے تھے۔ احقر کے خیال میں آپ کی خاص خصوصیت محض مطالعہ کی کثرت اور جزئیات پر دسترس وغیرہ نہیں، بلکہ فقہی ملکہ اور خداداد ذہانت تھی۔ اس کے ساتھ آپ پختہ استعداد کے مالک، نہایت زیرک، سخن فہم اور گہری نگاہ کے مالک تھے۔ کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ کسی چیز کو محض اپنے ذوق سے آپ نے مسترد کیا اور بعد میں تلاش بسیار کے بعد اسی کے موافق نص مل گئی۔ دنیوی گورکھ دھندوں سے آپ منقطع تھے اور ''**الذین أحصروا فی سبیل اللّٰہ**'' کے کامل مصداق اور اتم نمونہ تھے، مگر اس کے باوجود سیاسی قوانین، معاشی نظریات، رسم و رواج، عرف و عادات اور ملکی حالات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔ مسجد اور مدرسہ میں زندگی بسر کرنے کے باوجود لوگوں کی عادات اور ان کے محاورات پر آپ کی گرفت مضبوط تھی، طلاق اور ایمان کے مسائل میں اس کا خوب اندازہ ہوا کرتا تھا۔ کام کا جتنا دباؤ دارالافتاء بنوری ٹاؤن میں ہے، شاید ہی کسی اور جگہ ہو، مگر افرادی قلت کے باوجود اُسے بہ سہولت پورا فرمالیا کرتے تھے۔ ۱۹۹۸ء سے اب تک فتاویٰ کی آخری تصحیح آپ فرمایا کرتے تھے۔ ہر سال تقریباً دس ہزار فتاویٰ دارالافتاء سے جاری ہوتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کے فتاویٰ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ بنتی ہے۔ جو فتاوی اس سے قبل کے زمانے کے ہیں اور جو دیگر مدارس سے جاری کئے اور جن کی تصدیق فرمائی، ان کی تعداد اس کے علاوہ ہے، مگر ان میں شاید و باید ہی کوئی ایسا فتویٰ ہوگا جو اکابر کے مزاج کے خلاف اور جمہور کے مسلک سے کٹ کر ہو۔ **رحمہ اللّٰہ وارضاہ۔**

پچھلے کچھ عرصے سے ایک خاص قسم کا تغیر طبیعت میں پیدا ہوگیا تھا۔ اللہ جانتا ہے کہ جب یہ کیفیت طاری ہوتی یا تنہائی میں اس کی طرف دھیان جاتا تھا تو ذہن سورۂ نصر کی طرف چلا جایا کرتا تھا اور طبیعت فراق کے خیال سے پریشان ہوجایا کرتی تھی۔ اب حضرت شہیدؒ ایک ایک لمحے کو ذکر

الٰہی سے آباد کرنے لگے تھے، یہاں تک کہ سوال وجواب پڑھتے وقت تو ہونٹ ساکت رہتے تھے، مگر جونہی دستخط فرمانے لگتے، لب حرکت کرنے لگ جاتے، ہونٹوں کو جنبش شروع ہوجاتی، حالانکہ سوالات کی کثرت کی وجہ سے نام کی مہر بنوانی پڑگئی تھی، جس کے ثبت کرنے میں ایک دوسیکنڈ لگتے تھے، مگر حضرت اس کو بھی مزید پرنور بناتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ فوری طور پر رقت قلبی طاری ہوجایا کرتی تھی۔ محسن انسانیت، سیدالکونین، سرکار دوعالم ﷺ کے نام نامی اور اسم گرامی پر آبدیدہ ہوجایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور ان کے تذکرے پر طبیعت میں ایک جوش سا پیدا ہوجایا کرتا تھا اور موضوع سخن چھوڑ کر ان کا کوئی واقعہ یا منقبت یا ان کی بلند پایہ شخصیت کے متعلق کوئی جملہ ارشاد فرمالیا کرتے تھے۔

جو عالم دین کوئی دینی مشغلہ رکھتا ہو مثلاً درس وتدریس، تصنیف وتالیف یا وعظ ونصیحت کرتا ہو اور اسی حالت میں وفات پاجائے تو اس کی موت حکمی شہادت کی موت ہے اور جو ناحق آلۂ جارحہ سے مارا جائے اور وہ کوئی دنیوی آسائش بھی نہ اٹھائے تو اس کی موت حقیقی شہادت کی موت ہے۔ حضرت الاستاذ، مشفی ومربی کو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں معنوں کے لحاظ سے شہادت نصیب فرمائی ہے۔ شہادت کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گہری نیند میں ہیں اور اپنے مقام بلند کو دیکھ کر تبسم فرمارہے ہیں۔

جامعہ کے مہتمم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب حفظہ اللہ ورعاہ نے شہداء کا جنازہ پڑھایا، لگتا تھا کہ تکبیرات کے ساتھ جگر کے ٹکڑے نکل کر باہر نہ آجائیں، مگر خدا تعالیٰ جب کوئی ذمہ داری ڈالتا ہے تو اس کے لئے درکار صفات سے بھی نواز دیتا ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب استقامت نہ دکھاتے تو کس کا دل گردہ تھا کہ وہ صبر کرجاتا۔ جنازے سے قبل حضرت ڈاکٹر صاحب نے جو کلمات ارشاد فرمائے، وہ مختصر مگر جامع، سادہ مگر مدلل، صدمات سے چُور روح کے ترجمان اور روحِ شریعت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس وقت یہ حقیقت کھلی کہ ''**الاستقامة فوق الكرامة**''۔ جنازے میں بہت قلیل وقت میں بہت بڑا مجمع جمع ہوگیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے موقع پر چند آدمیوں نے مل کر ملکوں کے ملک راکھ اور خاک کردیئے، ایک غیر محتاط جملے سے یہ لوگ کچھ کرنے اور دکھانے، مرنے اور مارنے پر آمادہ ہوسکتے تھے، مگر ایمان اور دینی تربیت نے اُنہیں روک دیا۔ جامعہ کے اکابر نے نہ صرف خود صبر کیا، بلکہ صبر کی فضا بنادی، جس یہ تمام مجمع انتہائی پرامن طور منتشر ہوگیا۔ نہ کوئی نعرہ لگا، نہ کوئی شیشہ ٹوٹا اور نہ کسی کو بے جا تکلیف ہوئی، ورنہ دینی تربیت سے عاری لوگ ایسے مواقع پر کیا کچھ نہیں کرگزرتے۔ جنازے کے بعد حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کو ان کے آبائی شہر خان پور لے جایا گیا اور مدینۃ الاولیاء، مقبرۃ المشائخ دین پور میں آہوں اور سسکیوں کے ساتھ سپرد خاک کردیا گیا۔ یہ وہی مقبرہ ہے جس میں حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا عبداللہ درخواستیؒ جیسے بڑے بڑے اولیاء اور مشائخ مدفون ہیں۔ مرقد میں رکھنے کے بعد جب چہرے سے ذرا کفن سرکا تو چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا اور ماہتاب کی مانند پُرنور تھا۔ **أللّٰهم لاتحرمنا أجره ولاتفتنا بعده.**